زندگی

(غزلیں، نظمیں، ماہیے)

حیدر قریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

ZINDGI

Poetry By: ***Haider Qureshi***

نام کتاب: **زندگی** (غزلیں، نظمیں، ماہیے)
شاعر: حیدر قریشی
اشاعت اول: ۲۰۱۳ء (**قفس کے اندر** کے عوامی ایڈیشن میں شامل)
تعداد: ۵۰۰
مطبع:
قیمت: ۱۰۰ روپے

انٹرنیٹ ایڈیشن
جنوری ۲۰۱۴ء

انتساب

اپنے ماموں
پروفیسر ناصر احمد (مرحوم) کے نام

دُکھ اور سُکھ کے اتنے ہی میلے تھے بس قسمت میں
جیون کے اس کھیل میں اپنا، اتنا ہی تھا رول

کبھی جو دل سے تری یاد ہمکلام ہوئی
تو چشمِ نَم کو ستارے پکارا کرتے ہیں

ترتیب

غزلیں

آٹھ پرانی غزلیں اور دو پرانی نظمیں

نظمیں

اور تھے حیدرؔ جو اس کی چاہ میں مرتے رہے
ہم نے اُلٹے ہاتھ سے جھٹکی ہوئی ہے زندگی

(بہ فیضِ بلھے شاہ)

رقص کناں ہے جس کے اندر ازل، ابد کا مور
وہ ہے اک بے انت خلا سا جس کی اور نہ چھور

اک دل کا پھیلا صحرا ، خاموشی سے معمور
اک کم ظرف سمندر ،جس میں خالی خولی شور

سارے حوالے برکت والے نور بھرے دربار
کوٹ مٹھن،اجمیر شریف اور دہلی ، اور لاہور

حال،دھمال سے تن من روشن،روشن ہو گئی جان
جگمگ کر اٹھی ہو جیسے ایک اندھیری گور

اپنی اڑانیں، ساری شانیں،تیرے دَم سے یار
تیرے ہاتھ ہوائیں ساری تیرے ہاتھ میں ڈور

رشتے ناطے اور تعلق کیسے میرے یار!
کب کچھ مان کسی پر اپنا، کب کچھ اپنا زور

مَن سے لے کر بُکل تک ہوں ویران و حیران
چوری کرنا چھوڑ گئے ہیں میرے سارے چور

سات سمندر سے تو اپنے پاپ نہیں دُھل پائے
تو ہی بھیج اب دل کے صحرا کوئی گھٹا گھنگھور!

حیدؔر نے پہچان کے تجھ کو جانا تیرا بھید
''بلھے شاہؔ اساں مرنا ناہیں، گور پئے کوئی ہور''

☆☆☆

اس نے تو اپنا سارا کچھ میرے ہی نام لکھ دیا
کیسے سیاہ بخت کو ، ماہِ تمام لکھ دیا

اندر کی جانب اور بھی اندر سفر کیا شروع
ازلی مسافروں کو جب اس نے قیام لکھ دیا

دل یہ سمجھ کے خوش ہوا،مزدوری ختم ہو چکی
قسمت نے عشق کا اسے،ایک اور کام لکھ دیا

آوارگی کو میری قید اُس نے کچھ ایسے کر لیا
ہونٹوں سے مہر ثبت کی،دل میں مقام لکھ دیا

حیدؔر ہمارے عہد میں،اکیسویں صدی میں بھی
میرؔا نے اپنے ہاتھ سے رادھاؔ کو شاؔم لکھ دیا

☆☆☆

رہا نہ کام علامت یا استعارے کا
یہاں تو عشق ہے جیسے بجٹ خسارے کا

عجیب لہر سی دونوں کے من میں اُٹھی تھی
رہا نہ فرق سمندر کا اور کنارے کا

کبھی تھا ہجر میں بھی وصل کا مزہ لیکن
ہے وصل ہجر زدہ آج ہجر مارے کا

تمہارے جوش بھی سب ٹھنڈے پڑ گئے پیارے
ہمارا پیار بھی بس رہ گیا گزارے کا

دُکھ آیتوں سے بھری اس کی ہر کہانی ہے
عجیب رنگ ہے اس دل کے ہر سپارے کا

گھِرا ہوا ہوں اندھیرے بھنور کے چکر میں
یقیں کیا تھا کسی ’’روشنی کے دھارے‘‘ کا

خدا پہ چھوڑ دو سارا معاملہ حیدرؔ
نتیجہ جو بھی نکل آئے استخارے کا

☆☆☆

آنکھ سے گر کر ٹوٹے خواب کھلونے ہیں
اور اب دل کے ، بچوں جیسے رونے ہیں

عمرِ لا حاصل کا جو حاصل ٹھہرے
کس نے ایسے داغِ ملامت دھونے ہیں

درد ہمارے تو انمول نکل آئے
گرچہ خرید ے ہم نے اونے پونے ہیں

صرف گناہوں کا ہی بوجھ نہیں سر پر
اپنے نیک اعمال بھی ہم کو ڈھونے ہیں

رادھےؔ، میٹھے رادھے! کچھ پہچان ذرا
دیکھ ہمیں ہم تیرے شام سلونے ہیں

زخموں کی خیرات بھی کب مل پائے گی
حُسن سے کچھ احسان ہی ایسے ہونے ہیں

راس زمینِ دل کو غم ایسے آئے
غم کی فصلیں کاٹ کے، پھر غم بونے ہیں

یادوں کے پھولوں سے، اپنی پلکوں نے
اُس کی جیت پہ حیدرؔ ہار پرونے ہیں

عشق میں حیدرؔ باون سال کا ہو کے بھی
بیس برس کی عمر کے رونے دھونے ہیں

☆☆☆

8/اکتوبر 2005 کے قیامت خیز زلزلہ کی خبریں دیکھ
دیکھ کر 15/اکتوبر کو ارتجالاً غزل کے یہ اشعار ہو گئے۔
اس کے چھپنے کے بعد متعدد شاعروں نے اسی زمین میں طبع آزمائی کی۔

ٹوٹتے، گرتے ہوئے گھر نہیں دیکھے جاتے
بد دعا جیسے یہ منظر نہیں دیکھے جاتے

پھول چہروں پہ کھِنڈے ڈر نہیں دیکھے جاتے
آنکھ سے خوف کے پیکر نہیں دیکھے جاتے

ارضِ خوش رنگ کے سب کوہ و دمن لرزاں ہیں
خون روتے ہوئے پتھر نہیں دیکھے جاتے

گر گئے دستِ دعا گنبد و مینار کے ساتھ
خاک ہوتے ہوئے منبر نہیں دیکھے جاتے

زندگی رُلتی رہی کیسے قضا کے ہاتھوں
اور احوالِ ستم گر نہیں دیکھے جاتے

قہر برساتی ہے کہ چشمِ فلک روتی ہے؟
جو بھی ہے اس کے یہ تیور نہیں دیکھے جاتے

برفباری کا جہنم بھی چلا آتا ہے
منجمد ہوتے مقدر نہیں دیکھے جاتے

دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں اُتر آتے ہیں
اور یہ غم کے سمندر نہیں دیکھے جاتے

دیکھتے رہتے ہیں ہر حال میں حیدؔر پھر بھی
گرچہ ٹی وی کے مناظر نہیں دیکھے جاتے

☆☆☆

فصلِ غم کی جب نوخیزی ہو جاتی ہے
درد کی موجوں میں بھی تیزی ہوجاتی ہے

پانی میں بھی چاند ستارے اُگ آتے ہیں
آنکھ سے دل تک وہ زرخیزی ہو جاتی ہے

اندر کے جنگل سے آجاتی ہیں یادیں
اور فضا میں صندل بیزی ہو جاتی ہے

خوشیاں غم میں بالکل گھل مل سی جاتی ہیں
اور نشاط میں غم انگیزی ہو جاتی ہے

شیریں سے لہجے میں بھر جاتی ہے تلخی
حیلہ جوئی جب پرویزی ہو جاتی ہے

بے حد پاور جس کو بھی مل جائے،اس کی
طرز یزیدی یا چنگیزی ہو جاتی ہے

کوشش جتنی بھی بچنے کی کر لوں، پھر بھی
اردو میں کچھ کچھ انگریزی ہو جاتی ہے

غزلوں میں ویسے تو سچ کہتا ہوں لیکن
کچھ نہ کچھ تو رنگ آمیزی ہو جاتی ہے

حسن تمہارا تو ہے سچ اور خیر سراپا
ہم سے ہی بس شر انگیزی ہو جاتی ہے

ظاہر کا پردہ ہٹنے والی منزل پر
سالک سے بھی بد پرہیزی ہو جاتی ہے

رومیؔ کو حیدرؔ جب بھی پڑھنے لگتا ہوں
باطن کی دنیا طبریزی ہو جاتی ہے

☆☆☆

دیارِ دل میں کسی نے وُرود کرتے ہوئے
بجھا دیا، ہمیں روشن وجود کرتے ہوئے

یہ میرے جسم نے کیا کھیل مجھ سے کر ڈالا
مجھے نکال دیا بے وجود کرتے ہوئے

پہنچ گئے جو کنارے کبھی تباہی کے
تو بچ کے آ گئے وردِ دُرود کرتے ہوئے

کھڑے تھے شاہ کئی جھولیوں کو پھیلائے
فقیر گزرے تھے جس رہ سے جود کرتے ہوئے

کئی برس کی جدائی بھی کچھ بدل نہ سکی
وہ زُودرنج ملا، رنج زُود کرتے ہوئے

کسی کی یاد جلائی تھی جس گھڑی حیدؔر
فضا مہک اُٹھی صندل کو دُود کرتے ہوئے

☆☆☆

دل کہیں پر ہے اور دماغ کہیں
اپنا ملتا نہیں سراغ کہیں

وصل کی شب کہیں پہ اُتری ہے
بجھ گیا ہجر کا چراغ کہیں

مئے رُخسار و چشم و لب اتنی
چھوٹا پڑ جائے نہ ایاغ کہیں

لَو لپکتی، نہ دُود سا کچھ تھا
عشق کا جل رہا تھا داغ کہیں

خواب مجھ سا ہی دیکھ کر کوئی
ہو رہا ہوگا باغ باغ کہیں

نقطۂ علم کے سمجھنے کو
دل سا، لائے کوئی دماغ کہیں

اک تصور میں کھو گئے ایسے
اب میسر نہیں فراغ کہیں

جتنا ممکن تھا، اُتنا وعدہ تھا
کب دکھائے تھے سبز باغ کہیں

محوِ پرواز ہے ابھی حیدرؔ
رہ گئے راستے میں زاغ کہیں

☆☆☆

وصل کی تفہیم،تفریقِ ہوس کرتے ہوئے
مان ہی جائے گا آخر پیش و پس کرتے ہوئے

آنکھ سے اوجھل کیا،اذنِ سفر دے کر ہمیں
اور دل میں رکھ لیا،دل کو قفس کرتے ہوئے

پختگی ایمان میں آئی ہے پہلے سے سوا
دشمنِ ایماں کو اپنا ہم نفس کرتے ہوئے

فون سے بھی اس کے ہونٹوں کا اثر آیا سدا
گھولتا ہے کان میں ،لفظوں کو، رَس کرتے ہوئے

پھیلتی جاتی ہے اس کے لمس کی دل میں دھنک
اُس نے دیکھا اس طرح نظروں سے مَس کرتے ہوئے

عمر کی ناپائیداری کا بھی کچھ تو سوچتے
وصل کی تاریخ کو اگلے برس کرتے ہوئے

آخری منزل سمجھ کر ،جسم و جاں کا قافلہ
رُک رہا ہے، بند آوازِ جرس کرتے ہوئے

اب نہ وہ زورِ بیاں حیدرؔ ،نہ اب وہ رات دن
پھر شروع ہوجانا اک قصہ کو بس کرتے ہوئے

☆☆☆

چلے تھے جستجوئے بے حدی کی حد کے لیے
ازل سے محوِ سفر ہیں ترے ابد کے لیے

ترے خیال کی تجرید کے یہ متلاشی
رُکے نہیں ہیں کسی ظاہری کے رد کے لیے

ابھی سکوت سا طاری ہے دل پہ بوجھل سا
کہ تیرہ دن ہیں ابھی پورے جزرو مد کے لیے

قبولیت کی اچانک گھڑی میں وقت نہ تھا
کسی مزید تقاضے یا ردو کد کے لیے

کفن مِرے لیے دامانِ یار ٹھہرے گا
چلوں گا کوچۂ دلدار میں لحد کے لیے

ہم اپنے صفر زمانے میں مست تھے حیدرؔ
وہ ناز کرتے رہے اپنے ہر عدد کے لیے

☆☆☆

افلاک کی لگن میں زمیں کے نہیں رہے
یارانِ تیز گام کہیں کے نہیں رہے

دنیا سمیٹنے میں ہی دنیا سے کٹ گئے
جب دین کو سمجھ گئے دیں کے نہیں رہے

دل کی زمیں کو چاند ستاروں سے بھر لیا
ہم صرف ایک ماہ جبیں کے نہیں رہے

حُسنِ ازل کی چاہ میں بھٹکے ہیں جابجا
ویسے تو ہم کسی بھی حسیں کے نہیں رہے

دو گز کی ایک قبر بھی قسمت کی دین سے
باقی مکاں کسی بھی مکیں کے نہیں رہے

صحراؤں میں بھی رونقیں شہروں کی آ گئیں
ہم بادیہ نشیں تو کہیں کے نہیں رہے

قدموں سے حیدرؑ اُن کے لپٹتے ہیں اس طرح
جیسے یہ سجدے میری جبیں کے نہیں رہے

☆☆☆

کون انگڑائی سی لیتا ہے نفس کے اندر
لذتِ وصل مہکتی ہے ہوس کے اندر

پھر سے در پیش ہوا لگتا ہے باہر کا سفر
لہر سی اُٹھنے لگی ہے کوئی نَس کے اندر

رَس بنایا گیا اس زندگی کو پہلے، پھر
موت کا زہر ملایا گیا رَس کے اندر

پھول نے صرف بکھیری ہے مہک بھینی سی
اصل خوشبو تو وگرنہ ہے سِرَس کے اندر

قافلے والے بہت خوش تھے دَمِ رخصت تو
سسکیاں کس کی تھیں آوازِ جرس کے اندر

کُن کا اک لفظ اسیروں پہ کہیں سے اترا
آسماں ہو گئے تخلیق قفس کے اندر

حیدؔر اک اور ہی دنیا ہے یہ انٹرنیٹ کی
کیا سے کیا ہو گیا ہوں سات برس کے اندر

☆☆☆

یہ واقعہ ہوا اپنے وقوع سے پہلے
کہ اختتامِ سفر تھا ، شروع سے پہلے

نہیں تھی لذتِ سجدہ، رکوع میں لیکن
اک اور کیف تھا،کیفِ خشوع سے پہلے

نصوص کو بھی کبھی دیکھ لیں گے فرصت میں
ابھی نمٹ تو لیں''مومن'' فروع سے پہلے

معافی مانگنا پھر بعد میں خلوص کے ساتھ
گناہ کرنا خشوع و خضوع سے پہلے

اُسی کے پاس تو جانا ہے لوٹ کر آخر
سو خوب گھومئے ، پھریئے ، رجوع سے پہلے

سیاہِ شب نے تو اندھیر کر دیا تھا بہت
سو آگیا ہوں میں وقتِ طلوع سے پہلے

یہ عید آئی ہے کس قتل گاہ میں حیدؔر
سلام پھیر لیا ہے رکوع سے پہلے

☆☆☆

جیسی بھی ہے اس دنیا سے کٹ کر نہیں رہنا
جب پیار بڑھانا ہے تو ڈٹ کر نہیں رہنا

دُوری بھی مٹانی ہے محبت کے سفر میں
اک حد کو بھی رکھنا ہے،لپٹ کر نہیں رہنا

اپنوں کو تو کچھ اور بھی نزدیک کریں گے
سوچا ہے کہ غیروں سے بھی ہٹ کر نہیں رہنا

لازم ہے سنا جائے کھلے ذہن سے سب کو
اپنے ہی خیالات میں اَٹ کر نہیں رہنا

جتنا ہوں حقیقت میں ، وہی دِکھنا ہے مجھ کو
اوروں کے لیے بڑھ کے یا گھٹ کر نہیں رہنا

کچھ اپنے دل و ذہن کو نزدیک کیا ہے
اندر بھی زیادہ ہمیں بٹ کر نہیں رہنا

رہنا ہے بہرحال یہیں پر ہمیں حیدرؔ
دنیا سے مگر اتنا چمٹ کر نہیں رہنا

☆☆☆

بخشی تھی ہجر نے جو تب و تاب لے گیا
اس جسم کو تو وصل کا سیلاب لے گیا

خوابوں سے بڑھ کے پیار کی تعبیریں بخش کے
جاتے ہوئے وہ میرے سبھی خواب لے گیا

دامن کو میرے بھر گیا چین و قرار سے
بدلے میں وہ مِرا دلِ بے تاب لے گیا

کر دی ہیں ماند رونقیں دریائے جان کی
رقصاں تھے اس میں جتنے بھی گرداب لے گیا

تاکہ کسی سفر پہ نکل ہی نہ پاؤں اب
ہمراہ اپنے وہ مِرا اسباب لے گیا

پہلے تو اس نے کی تھیں عنایات بے شمار
پھر جو بھی میرے پاس تھا نایاب، لے گیا

سیراب کر کے، پیاس کی لذّت کو چھین کر
صحرا کے ضابطے، ادب آداب لے گیا

جگنو، ستارے، اشک، محبت کے ہم سفر
میرے تمام ہجر کے احباب لے گیا

اک روشنی سے بھر گیا حیدؔر مِرا وجود
بے شک وہ میرے سورج و مہتاب لے گیا

☆☆☆

جتنے سیاہ کار تھے نردوش ہو گئے
ہم سر جھکا کے شرم سے خاموش ہو گئے

فریاد جتنا شورِ قیامت اُٹھا گئی
منصف ہمارے اور گراں گوش ہو گئے

جب باغیانہ ہمت و جرأت نہیں رہی
شہرِ ستم گراں میں ستم کوش ہو گئے

اہلِ خرد جو ہونے لگے اور ہوشیار
دیوانے بھی سیانے و باہوش ہو گئے

نیکی ہماری ایک بھی ان کو رہی نہ یاد
سب زود رنج، زود فراموش ہو گئے

اب کے شرابِ غم میں کچھ ایسا سرور تھا
چکھتے نہ تھے جو،وہ بھی بَلا نوش ہو گئے

دل کی تو کیا خود اپنی خبر بھی نہیں ملی
جس دن سے میرے دل میں وہ روپوش ہو گئے

ہجر و وصال ہو گئے یکجا کچھ اس طرح
جذبات پھر سے جاگ اُٹھے،پُر جوش ہو گئے

حیدؔر جب اس نے چاہ سے غم کر دیئے عطا
تو ہم بھی والہانہ غم آغوش ہو گئے

☆☆☆

پہنچائی گرچہ آپ نے ہر ممکنہ گزند
اک سرنگوں کو کر دیا مولا نے سر بلند

جو جتنا رب کے شکر سے لبریز ہو گیا
اللہ نے کردیا اسے کچھ اور ارجمند

اِتنے ہی ہم مزاج تھے،اِتنے ہی مختلف
جو مجھ کو ناپسند تھا،اُس کو رہا پسند

اُس کے خیال میں اُڑی مچھلی ہوا میں، تو
ہم نے لگائی ایڑ،سمندر میں تھا سمند

مسجد میں ہم گئے تو وہ جائیں گے چرچ میں
ہم قادیاںؔ گئے تو وہ جائیں گے دیو بندؔ

اک بائبلؔ کہے تو کہے ویدؔ دوسرا
قرآنؔ ایک لائے تو لے آئے ایک ژندؔ

قسمت میں تھا یہی کہ پلٹ کر نہ جا سکیں
ہم بام تک پہنچ گئے،ٹوٹی نہیں کمند

پھر بھی تباہ ہو گیا،جیسے بھی ہو گیا
ہم مستِ حالِ فقر تو وہ سخت خود پسند

دونوں گناہگار ہی کچھ لاڈلے سے تھے
دونوں نے مل کے کھولا تھا بابِ قبول بند

اک دوسرے کو زخم بھی دیتے ہیں پیار سے
اک دوسرے کے واسطے دونوں ہیں دردمند

☆☆☆

پہلے آدھا ملک ہمارا توڑ دیا
باقی کو دہشت گردی سے جوڑ دیا

خود کش حملے، خونریزی و بربادی
کن رستوں پہ لا کے قوم کو چھوڑ دیا

غیروں سے بدلہ لینے کے چکر میں
پورے دیس کا حلیہ موڑ ، تروڑ دیا

جس نے تھوڑا سا بھی سمجھانا چاہا
اس کے گھر پہ جا کے بم اک پھوڑ دیا

مولا! کیا تو نے بھی بے بس لوگوں کو
بے رحموں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا

کس نے عذاب میں ڈالا ساری دنیا کو
کس نے کس سے مل کے روس کو توڑ دیا

کس کے ''جہاد'' نے امریکہ کو طاقت دی
اور دنیا کو یہ ''تاریخی'' موڑ دیا

بولو کتنے زخم لگانا باقی ہیں
جسدِ وطن کو اتنا تو بھنبھوڑ دیا

حیدرؔ بے حس میں احساس کہاں، پھر بھی
کچھ احساس دلانے کو جھنجھوڑ دیا

☆☆☆

کتنے تفکرات لیے آرہی ہے عید
مہنگائی جیسے لُوٹ گئی قوتِ خرید

یا خودکشی کی خبریں ہیں یا خودکشوں کا کھیل
صاحب! کہاں کی رونقیں اور کیسا شوقِ دید

اک دوسرے کا قتل ہے شوق جہاد میں
اِس کے بھی سب شہید ہیں،اُس کے بھی سب شہید

افسوس ہم میں اک بھی حسینؓ نہیں رہا
اور دندنا رہا ہے یہاں لشکرِ یزید

خوش فہمیوں سے اب بھی نہ نکلیں تو کیا کہیں
جن کو بشارتوں کا نتیجہ ملا وعید

اپنے کیے دھرے کی سزا میں ہیں مبتلا
اب بھی اگر نہ سمجھے تو بھگتیں گے پھر مزید

وہ پاک باز ہم پہ مسلط کیے گئے
حیدرؔ دیارِ پاک کی مٹی ہوئی پلید

☆☆☆

اسی طریقے سے دونوں گزارا کرتے ہیں
ہم ان کو اور ہمیں وہ گوارا کرتے ہیں

اگر ہے دل میں تذبذب سا کچھ ابھی تک تو
تشفّی کے لیے پھر استخارا کرتے ہیں

بساطِ منظر و ناظر بچھانے والے اب
ہمارے کھیل کا خود بھی نظارا کرتے ہیں

کبھی جو دل سے تری یاد ہمکلام ہوئی
تو چشمِ نَم کو ستارے پکارا کرتے ہیں

نئے زمانے۔۔نئے آسمان سے آ کر
نئی زمینوں کی جانب اشارا کرتے ہیں

ستارے جس پہ نچھاور تو کہکشاں ہو فدا
ہم ایسی دھرتی پہ سورج کو وارا کرتے ہیں

ہمیں تو اپنے ہی شہروں کی بات کرنی ہے
وہ اور ہیں جو بخارا، بخارا کرتے ہیں

نئے کچھ اور کی خواہش بھی اب نہیں دل میں
نہ اپنے پہلے کیے کو دوبارا کرتے ہیں

تمام خواہشیں حیدؔر کبھی کی چھوڑ چکے
کہو تو خود سے بھی اب ہم کنارا کرتے ہیں

☆☆☆

دردِ دل کی ہمیں اب کے وہ دوائی دی ہے
اپنے دربار تلک سیدھی رسائی دی ہے

اک جھماکا سا ہوا روح کے اندر ایسے
نوری برسوں کی سی رفتار دکھائی دی ہے

کیسے زنجیر کا دل ٹوٹا یہ اُس نے نہ سُنا
وقت نے قیدی کو بس فوری رہائی دی ہے

اک نئی لمبی مسافت کا زمیں زاد کو حکم
اور اس بار مسافت بھی خلائی دی ہے

جب بھی جانا ہے پلٹ کر نہیں دیکھیں گے کہیں
اپنے اندر سے یہ آواز سنائی دی ہے

جتنے دکھ درد تھے،دل میں ہی ڈبو ڈالے ہیں
ہم نے فریاد کبھی کی نہ دُہائی دی ہے

اُن فقیروں کے لیے ایک خدا کافی ہے
اہلِ دنیا کو جنہوں نے یہ خدائی دی ہے

اک عجب عالمِ برزخ میں ہی رکھا اس نے
نہ کبھی قرب ہی بخشا نہ جدائی دی ہے

کسی الزام کا اقرار بھی حیدؔر نہ کیا
نہ بریت کے لیے کوئی صفائی دی ہے

☆☆☆

اظہار کی اِس دل نے اس بار تو حد کر دی
ہر بات مگر اُس نے اِس بار بھی رد کر دی

جو کام نہ ہونا تھا،وہ ہو ہی گیا آخر
کچھ ہم نے بھی ہمت کی،کچھ اس نے مدد کر دی

اس درد سمندر میں اک جزر تھا مدّت سے
اس درد سمندر میں کیوں آپ نے مد کر دی

جو مانتے ہیں دل سے وہ کھل کے نہیں کہتے
یاروں کے رویے نے توثیقِ حسد کر دی

اعداد ہوئے غالب تو آج کی دنیا نے
ہر حرف کی حرمت ہی اب زیرِ عدد کر دی

وا گود رکھی اس نے،بیداری رہی جب تک
جب نیند کا وقت آیا ،گود اس نے لحد کر دی

نکلے تھے ازل سے جواک لہریں،سو ان کی
قسمت نے مسافت بھی تاحدِ ابد کر دی

تھے زیر و زبر دونوں،اک زیر ہوا آخر
پھر آخری لمحے میں اس زیر نے شد کر دی

شدت کا رویہ ہی عادت سی رہی اس کی
نفرت بھی بلا کی تھی،چاہت بھی اشد کر دی

جب عشق کیا حیدؔر معیار بنا ڈالا
اور ایسی محبت کی،دنیا میں سند کر دی

☆☆☆

(۱۹۷۵-۷۷ کے عرصہ میں مدینہ بھاولپور میں چھپی ہوئی ایک غزل کے پہلے دو اڑھائی شعر یاد آنے پر اس غزل کو نئے سرے سے مکمل کر لیا ہے۔۔ح۔ق)

کوئی آوارہ ہے یا بھٹکی ہوئی ہے زندگی
موت کی نظروں میں جو کھٹکی ہوئی ہے زندگی

شور سنتے تھے بہت لیکن حقیقت اور ہے
ایک ہی تو سانس پر اٹکی ہوئی ہے زندگی

کربلا کی خاک پر روندی گئی ہے اور کبھی
نفرتوں کی دار پر لٹکی ہوئی ہے زندگی

دھوپ میں ٹھنڈک،تمازت گھل گئی ہوں جس طرح
ایسے سارے دہر میں چھٹکی ہوئی ہے زندگی

رنگ و خوشبو کا کوئی جادو اسی کے دَم سے ہے
گلشنِ ہستی میں جو چٹکی ہوئی ہے زندگی

یہ تو بس موّاج لہروں کا انوکھا کھیل ہے
کب کسی ساحل،کسی تٹ کی ہوئی ہے زندگی

اور تھے حیدؔر جو اس کی چاہ میں مرتے رہے
ہم نے الٹے ہاتھ سے جھٹکی ہوئی ہے زندگی

☆☆☆

ترا مقصود ہو کر رہ گیا ہے
یہ دل محدود ہو کر رہ گیا ہے

جو ناموجودیت میں بیکراں تھا
وہ بس موجود ہو کر رہ گیا ہے

جہاں ملنے تھے اپنے دل،وہ رستہ
بہت مسدود ہو کر رہ گیا ہے

زیاں کے شوق میں نکلے تھے لیکن
زیاں بھی سود ہو کر رہ گیا ہے

بڑی ''مقبولیت'' حاصل تھی اس کو
بڑا مردود ہو کر رہ گیا ہے

کسی پر آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے
کوئی نمرود ہو کر رہ گیا ہے

سدا انکار تھی پہچان جس کی
سراپا جُود ہو کر رہ گیا ہے

بہت ہی پیار وہ کرتا ہے مجھ سے
وہ کب معبود ہو کر رہ گیا ہے

کبھی شعلۂ جوّالہ تھا، حیدرؔ
یہ دل اب دُود ہو کر رہ گیا ہے

☆☆☆

نہ جانے کیوں تمناؤں کی طغیانی میں رکھا ہے
ابھی تک دل نے خود کو عہدِ نادانی میں رکھا ہے

یہ کیسا آئنہ رُو اب کے میرے روبرو آیا
مجھے جس نے مسلسل ایک حیرانی میں رکھا ہے

کوئی خواہش ہو،اب کہتے ہی فوراً مان لیتا ہے
ستم گر نے مجھے اب بھی پریشانی میں رکھا ہے

عنایت میں بھی اک طرزِ ستم محسوس ہوتا ہے
نہ لاؤں تاب جس کی ایسی تابانی میں رکھا ہے

دکھائی شانِ فقراپنی تمہاری بادشاہی میں
فقیری عجز اپنے عہدِ سلطانی میں رکھا ہے

ہے میری روح میرے جسم کے ہر ذرّہ میں پنہاں
تو اپنے جسم کو اک شہرِ روحانی میں رکھا ہے

دیارِ حُسن میں خیرات کی خواہش نہیں رہتی
بخیلوں نے بخیلی کو فراوانی میں رکھا ہے

بہت سی بے نیازی اور اک یادوں بھری گٹھڑی
بڑا سامان اپنی خستہ سامانی میں رکھا ہے

یہاں سے رونقیں دکھ درد کی جاتی نہیں حیدؔر
دکھوں کا ایسا میلہ اپنی ویرانی میں رکھا ہے

☆☆☆

گیان،دھیان کے رستوں پر اب اور نہ مجھ کو رول
میرے مالک! مجھ پر میرا ساتواں دَر بھی کھول

ایک نئے آدم کی پھر تشکیل ہے میٹھے پانی!
جذب ہو میری مٹی میں یا مجھ کو خود میں گھول

دنیا کو سمجھائیں کیسے، آخر کیسے سمجھے
باتیں اپنی سچی،سیدھی اور دنیا ہے گول

قیمت اپنی کچھ بھی نہیں تھی، شان ہے اُس پیارے کی
یاروں نے بے مول کیا تھا، اُس نے کیا اَنمول

کب اپنی پہچان کے سارے بھید کھلے ہیں خود پر
جھانک ابھی کچھ اور بھی اندر،من کو اور ٹٹول

کتنی اور زمینیں تیرا رستہ دیکھ رہی ہیں
اس دھرتی سے آگے چل،اب اُڑنے کو پر تول

دُکھ اور سُکھ کے اتنے ہی میلے تھے بس قسمت میں
جیون کے اس کھیل میں اپنا اتنا ہی تھا رول

راضی ہوں تیری مرضی پر لیکن بھید کھلے بھی
تیری مرضی کیا ہے یارا، کچھ تو کھل کر بول

ہجر کی رُت میں بھی پیغام وصال کا آیا حیدرؔ
دیکھ! بُلاوا آیا ہے تو مت کر ٹال مٹول

☆☆☆

عشق میں سب کچھ اک جیسا ہے،کیا پانا،کیا کھونا
لذت میں ملتا جلتا ہے ہنسنا ہو یا رونا

ساری ریاضت خاک ہوئی اور زعمِ کرامت ٹوٹا
اک درویش پہ چل گیا ایسا حُسن کا جادو ٹونا

جن و ملک سب سے اُکتا کر رب نے بنایا،آخر
سانسوں کی چابی سے چلنے والا ایک کھلونا

سُن یارا! مت اُلجھ تُو اُس سے جس کی ایک نظر ہی
سونے کو مٹی کردے، مٹی کو کردے سونا

زہریلی نفرت کا موسم جتنا زہریلا ہو
اپنی آنکھوں میں سچی چاہت کے خواب ہی بونا

ہم ہی کتنی دیر سے ساری بات کیے جاتے ہیں
اتنی دیر سے چُپ بیٹھے ہو،تم بھی کچھ تو کہو نا!

ڈر ہے رازوں کے افشا کا موجب نہ بن جائے
حیدؔر بھید بھرے دل کا اب چھید بھرا دل ہونا

☆☆☆

چند پرانی غزلیں
اور
ایک پرانی نظم

جدیدادب خانپور کے چند پرانے شماروں اور اپنی ایک مرتب کردہ کتاب ''کرنیں''اور ارشد خالد کے عکاس خانپور کے ایک شمارہ کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنیایک نظم اور آٹھ ابتدائی غزلیں ایسی مل گئیں جن کو اس مجموعہ میں الگ سے شامل کرنے کا خیال آ گیا،سو وہ تھوڑی سی ابتدائی زمانے کی شاعری یہاں شامل کر رہا ہوں۔۱۹۷۹ء،۱۹۸۰ء کا یہ وہ زمانہ تھا جب میں ادب میں جدیدیت کی انتہا پسند لہر کے زیر اثر اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

(حیدرقریشی)

نئی رُتوں کے جو منتظر تھے،اُجڑ گئے وہ گلاب چہرے
عذاب کی ایسی آندھیاں تھیں کہ بجھ گئے آفتاب چہرے

خموشیوں کی اُداس جھیلوں میں جھلملائے ہیں عکس ایسے
کہ جیسے میری سوال آنکھوں میں تیرتے ہوں جواب چہرے

گداز جسموں کی ہر صدا میں جواں گناہوں کا ہے تقدّس
وہی تقدس کہ جس کے صحرا میں دور تک ہیں سراب چہرے

میں وقت کے بہتے پانیوں پر نقوش چہروں کے کھینچتا ہوں
کوئی تو سمجھائے آکے مجھ کو کہ کب رُکے ہیں برآب چہرے

نہ پڑھ سکے داستان اپنی، نہ سوچ پائے کسی کی سوچیں
بکھر گئے لفظ لفظ حیدؔر، ورق ورق ہیں کتاب چہرے

☆☆☆

مرتب کردہ کتاب ''کرنیں''۔مطبوعہ ۱۹۸۰ء

برستے رنگ نگاہوں میں بھر کے لایا ہوں
سلگتے خواب بجھانے بھی خود ہی آیا ہوں

میں بے لباس خیالوں میں اس کو اپناؤں
کوئی تو مجھ کو یہ سمجھائے میں پرایا ہوں

ادھورے شہر کے اک بے صدا دریچے میں
یہ میں ہوں یا کوئی بے چہرگی کا سایا ہوں

وہ پڑھ سکا کبھی مجھ کو، نہ مجھ کو سوچ سکا
میں جس کی روح کا ہر لفظ جھانک آیا ہوں

میں ٹوٹ کر بھی ہوں پہچان وقت کی حیدرؔ
کہ ٹوٹتے ہوئے لمحوں میں آسمایا ہوں

☆☆☆

جدیدادب خانپور۔شمارہ نمبر۳۔سال۱۹۷۹ء

ہم اس قدر قریب تھے کہ جیسے کوئی خواب تھے
تھا ہجر کا عذاب بھی،مگر وصال یاب تھے

خموشیوں کے روگ سارے ،روح میں اتر گئے
ہمارے کچھ اصول تھے تو کچھ انہیں حجاب تھے

پھر اس کے بعد دوریوں کا سلسلہ تھا دور تک
ہم اپنی اپنی ذات ہی میں آپ اک عذاب تھے

یہ اور بات ایک دوسرے کو بھی نہ پڑھ سکے
وگرنہ ہم میں اپنے ہر سوال کے جواب تھے

☆☆☆

جدیدادب خانپور۔شمارہ نمبر۶۔ستمبر۱۹۷۹ء

آنکھوں سے تیری یاد کے منظر اتار کے
سوچا ہے دُور جاؤں کسی دیس پیار کے

سانسوں میں جم گیا ہے جدائی کی شب کا خوں
لمحے ٹھہر گئے ہیں ترے انتظار کے

ساری فضا پہ چھا گئے چمگادڑوں کے غول
آخر غروب ہو گیا سورج بھی ہار کے

حیدؔر خزاں کے ظلم کے ماتم سے کیا ملا
گلشن سجاؤ جوڑ کے ٹکڑے بہار کے

☆☆☆

عکاس۔خان پور۔دسمبر۱۹۸۱ء

یہ کیا ہوا کہ دعاؤں کے ہاتھ چھوٹ گئے
نئے دنوں کی صداؤں کے عکس ٹوٹ گئے

ہوا پہ لمس دھنک کے اتارنے والے
جواں رُتوں کے بدن خوشبوؤں کو لوٹ گئے

مجھے یقین ہے اک روز لَوٹ آئے گا
وہ جس کی یاد کے بھی حرف مجھ سے روٹھ گئے

میں اپنی کرچیاں اب کس طرح سمیٹوں گا
کرن کرن مِری آنکھوں کے خواب پھوٹ گئے

وہ بے قصور تھا،میری منافقت ہی سہی
چلو خلوص کے جھوٹے بھرم تو ٹوٹ گئے

☆☆☆

عکاس۔خان پور۔دسمبر۱۹۸۱ء

یہ کون دے گیا ہے مجھ کو بے طلب اداسیاں
کہاں سے آ گئی ہیں مجھ میں بے سبب اداسیاں

نہ جن کا کوئی رنگ ہے، نہ جن کا کوئی نام ہے
رگوں میں جگمگا اُٹھی ہیں کچھ عجب اداسیاں

تمام رات رتجگوں کا زہر چاٹتے رہے
نہ جانے اور ڈھائیں دل پہ کیا غضب اداسیاں

میں تب یقیں کروں کہ پیار میں اسیر ہے کوئی
کسی کی روح میں بھی تیر جائیں جب اداسیاں

تمام حرف ہوں گے سُرخرو اب انتظار کے
بس اور تھوڑی دیر کہ ہیں جاں بلب اداسیاں

☆☆☆

عکاس۔خان پور۔دسمبر۱۹۸۱ء

بے تاب ہوئے جاتے ہیں جذبات کے جنگل
اُگ آئے ہیں آنکھوں میں بھی صدمات کے جنگل

ہر شعر درختوں کی گھنی چھاؤں کا پیکر
اب کے ہیں گھنے کتنے خیالات کے جنگل

یہ فاصلے دُوری کے کوئی چیز نہیں ہیں
پھیلے ہیں مگر راہ میں لمحات کے جنگل

سورج کوئی اس دھرتی کے سینے پہ اتارو
کھا جائیں گے ورنہ اسے اس رات کے جنگل

منڈلاتے رہے ذہن پہ آسیب انا کے
اور چاٹ گئے مجھ کو مری ذات کے جنگل

☆☆☆

عکاس۔خان پور۔دسمبر۱۹۸۱ء

وہ کسی اندھے ہیولے سے بھی کم تر نکلا
میں جسے آئنہ سمجھا تھا وہ پتھر نکلا

خواب کا ٹوٹنا تو خیر مقدر تھا مگر
خواب ٹوٹا تو پھر آنکھوں سے بکھر کر نکلا

بے لحاظی سے کچھ اس کے بھی حجاب اترے ہیں
کچھ عقیدت کا مِرے دل سے بھی اب ڈر نکلا

خود کو دیکھا تو کوئی شاعرِ کم مایہ تھا
سوچنے بیٹھا تو جذبوں کا قلندر نکلا

گو ترے چاہنے والے تھے ہزاروں پیارے
سُرخرو عشق میں لیکن ترا حیدؔر نکلا

☆☆☆

عکاس۔خان پور۔دسمبر۱۹۸۱ء

موت کے جال اور ابدی زندگی

سنہری مچھلیاں پانی کے جال میں پھنسی ہوئی
تیرتی پھر رہی ہیں
روپہلی تتلیاں ہوا کے جال میں پھنسی ہوئی
اُڑ رہی ہیں
تیز ہوا پانی کی سرکش لہروں سے کھیل رہی ہے
سرکش لہریں کھیلتے کھیلتے ساحل سے جا ٹکراتی ہیں
اور پھر کسی شریر بچے کی طرح
دوڑ کے واپس آجاتی ہیں

لہروں کے ساحل سے ٹکرا کر واپس آنے کا منظر

کبھی کبھی ایسے لگتا ہے
جیسے لہریں اپنے آپ کو ڈھونڈ رہی ہیں
قطرہ قطرہ اپنی ذات کی کھوج میں ہے

تیز ہوا کی ساری تیزی
اس دھرتی کی آخری حد کو
چھو کر واپس آجاتی ہے
کششِ ثقل سے باہر جانا، اس کے بس سے باہر ہے
سر نیوٹن دور کھڑا مسکرا رہا ہے
اور اس کی تصویر اوندھی پڑی کچھ سوچ رہی ہے

لہریں خود کو ڈھونڈ رہی ہیں
دھرتی خود کو ڈھونڈ رہی ہے

لیکن دیکھو! تیز ہوا کیوں جھوم رہی ہے؟

شاید اس نے اپنے آپ کو ڈھونڈ لیا ہے
میں بھی خود کو ڈھونڈ چکا ہوں
سانسوں کے اس جال کو خود ہی کاٹ چکا ہوں
جال کی قید سے آزادی پر جھوم رہا ہوں!

☆☆☆

جدید ادب خانپور۔شمارہ نمبر ۲ سال ۱۹۷۹ء

صدر بُش کو عید مبارک!

سانحہ نائن الیون کے بعد افغانستان اور عراق پر حملوں کے دوران صدر بُش نے عید کے موقعہ پر عالمِ اسلام کو مبارک باد دی تھی۔اس کے جواب میں یہ نظم لکھی گئی۔بعض اخبارات اور ویب سائٹس میں چھپنے کے باوجود ابھی تک میں نے اسے اپنے کسی شعری مجموعہ میں شامل نہیں کیا تھا۔اب اس مجموعہ میں شامل کر رہا ہوں۔(ح۔ق)

ہمارے عہد کے ہیرو!
تمہارے دم قدم سے اب ہواؤں میں
انوکھا اسلحہ، بارود کی خوشبو لئے
گھرے دھوئیں کے بادلوں پہ رقص فرما ہے
فضاؤں میں تمہارے تیز تر رفتا طیاروں کی آوازیں
ابھی تک موت کے نغموں کی صورت گونجتی ہیں اور
ابھی بمبارمنٹ اور گولہ باری کی نئی طرزیں
نئے گیتوں میں جیسے ڈھلتی جاتی ہیں
عراقی اور افغانی لہو پی کر نشے سے جھومتے
''ڈیزی کٹر'' کا جشن جاری ہے

یہ ایسا جشن ہے جس میں
''بموں کی ماں'' خوشی سے ناچتی ہے اور
جہاں فرعون اور نمرود اور چنگیز کی اولاد کے
گلنار چہروں پر مسرت تمتماتی ہے

ہمارے عہد کے ہیرو!
ابھی ہم بے بسوں کے سر پہ اک لمبا محرم ہے
ہمارے واسطے ہر دن محرّم کا مہینہ ہے
سو ہم ماتم گزاروں کی کہاں عیدیں!

صلیبی جنگ کا اعلان کرنے والے
پیارے بُش!
ہمارے عہد کے ہیرو! (مگر کیا واقعی ہیرو؟)
ہماری عید ہو یا پھر تمہاری عید ہو
اب تو سبھی عیدیں تمہاری ہیں
سو ہم مجبور اور ماتم گزاروں کی طرف سے
تم کو سب عیدیں مبارک ہوں!

☆☆☆

بوند بھر روشنی

بوند بھر روشنی تھی مگر یوں لگا
جیسے اک بوند میں ہی سمندر بھرا ہو
میں اُس بوند میں تھا یا وہ بوند مجھ میں
ابھی تک یہ عقدہ نہیں کھل سکا ہے
مگر ایک منظر سا کچھ یاد ہے کہ
سمندر کے اندر سمندر گرا تھا
انوکھی سی اک روشنی کا عجب موج در موج سا
جگمگاتا ہوا سلسلہ تھا

جسم اور روح جیسے مقابل بھی تھے، باہم آمیز بھی
شاید ایسا ہی کچھ تھا یا کچھ اور تھا۔۔۔۔

ایسے لگتا ہے اب بوند بھر روشنی میں
فقط اک سمندر نہیں، جانے کتنے سمندر، رواں تھے
اس میں کتنے ہی سورج ستارے چمکتے تھے
اور کہکشائیں خلا در خلا رقص کے حال میں تھیں
جہاں ساری سمتیں ہی بے معنی سی ہو گئیں
سارے بُعد اور سارے زمانے
کسی ایک نکتے میں جیسے سمٹ آئے تھے
وہ نقطہ وہی بوند تھا
بوند بھر روشنی!

☆☆☆

جوابِ آں نظم

(ستیہ پال آنند کے بارے میں)

میاں آزاد ہے وہ
ذات میں جس کی
میاں خوجی بھی بستا ہے
کہانی کار تھا وہ اور کہانی خوب لکھتا تھا
مگر آزاد نظموں کی لگن نے خوامخواہ
اس کے کہانی کار کو شاعر بنا ڈالا
الو ہی شاعری کو بھی تماشا سا بنا ڈالا
میاں آزاد کے اندر میاں خوجی بسا ڈالا

اُسے یہ زعم تھا آزاد نظموں میں بھی
وہ قصے ہی لکھتا ہے
یہ زعم اب اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ وہ اب
تحقیق کے مضمون بھی آزاد نظموں ہی میں لکھتا ہے
وہ شاعر ہے مگر غزلیں نہیں کہتا
غزل کی صنف سے ناراض ہے خاصا
غزل کے شعر اس کو زہر لگتے ہیں
اسے احمد فرازؔ اس واسطے اچھا نہیں لگتا
کہ اس کے گرد ہر دَم خوبصورت عورتوں
کا جمگھٹا کیوں تھا

وہ اپنی شاعری کا آپ دیو آنند بنتا ہے
مگر آنند جس کا جا چکا اور اب فقط اک دیو ہے
میراجیؔ و راشدؔ سی شہرت کی تمنا کا
مگر اس کی حقیقت بھی
میاں آزاد کے اندر کے میاں خوجی جیسی ہے

میاں خوجی کہ جس نے اپنی نظموں کو
قرولی سا بنا ڈالا
سو اب جس سے بھڑکتا ہے
وہ اپنی فارسی زدگی پہ اتراتے ہوئے
نفرت میں اپنی ایسے اُس کو جھونک دیتا ہے
فقط دھمکی نہیں دیتا
قرولی نظم کی
سچ مچ اُسے وہ بھونک دیتا ہے!

☆☆☆

اجنتا کے غار کی ایک تصویر

یہ نظم میراجی کی نظم ''اجنتا کے غار'' سے متاثر ہو کر

اور ایک تصویر کو دیکھ کر لکھی گئی

ابھی کی بات ہے شاید یا کل کی ، ایسے لگتا ہے
مگر یہ بات تو صدیوں پرانی ہے
ہم اپنے پیار میں کھوئے ہوئے
اک دوسرے میں خود کو جیسے ڈھونڈتے تھے
ہمارا کھیل ابھی جاری تھا
جب تاریخ کے صفحات پر آندھی چلی
خانہ بدوشوں کے مقدس حملہ آور
جب مرے جغرافیہ کو روندتے بڑھتے چلے آئے
تب اس آندھی کے پہلے زور ہی میں

میں جنم چکر کے گھیرے میں چلا آیا
وہ اصحافِ کہف کا حال کچھ کچھ جانتی تھی
اس لیے آندھی سے بچنے کے لیے
اک غار میں وہ جا چھپی

جنم چکر میں لہراتا ہوا کتنے ہی جنموں تک
اسے میں ڈھونڈتا پھرتا رہا
میں ساری بستیوں، صحراؤں سے ہوتا
بیابانوں تلک پہنچا
اُسے ڈھونڈا صدائیں دیں
پہاڑوں اور دریاؤں سے گزرا
اور غاروں تک بھی جا پہنچا
تبھی اک غار میں تصویر کا پیکر بنی آخر وہ مجھ کو مل گئی
میں اس مُورت کو کتنی دیر تک حیرت سے بس تکتا رہا
تکتا رہا ۔۔۔ تکتے ہوئے

اس وقت خود حیرت سے مورت بن گیا
تصویر میں جب یک بیک جنبش ہوئی
انگڑائی سی لے کر وہ گہری نیند سے جاگی
اندھیرے غار کی دیوار سے نیچے اتر کر مسکرائی
میرے پاس آئی
مجھے بانہوں میں بھر کے بھینچ کے سینے سے لپٹایا
تو دو مہجور روحوں کا ملن جسموں کے رستے سے
ازل سے تا ابد پھیلے ہوئے لمحے میں جیسے نقش سے بھرنے لگا

دو مہجوروں کے وصلِ جاوداں کی یہ کہانی
خواب کو تعبیر دیتی ہے
اک ابدی کیف سے سرشار لمحے کی گواہی
آج بھی اُس غار کی تصویر دیتی ہے!

☆☆☆

ماہیے

صرف ایک ہی پل تھا وہ
خود ہی ابد بھی تھا
اور خود ہی ازل تھا وہ

صحرا میں چناب ایسی
سائبر کی دنیا
بیداری میں خواب ایسی

لیپ ٹاپ تک آ پہنچے
اپنے ہی کمرے میں
ہم آپ تک آ پہنچے

باتیں بھی ہوتی ہیں
اور میسنجر پر
گھاتیں بھی ہوتی ہیں

لکھنے میں بھی آسانی
اردو فائل کی
ترسیل بھی ارزانی

☆☆☆

تاثرات

اس منزل پر پہنچتے پہنچتے فکر کی بلندی، خیال کی نزاکت، غزل کے اسرار و رموز حیدر قریشی کی غزل گوئی کے وہ امتیازی اوصاف بن جاتے ہیں جہاں حقیقت اور رومانیت، کلاسیکیت اور جدیدیت ،مقامیت اور عالمیت اور ان سب پر غالب ایک مخصوص شاعرانہ کیفیت نے ان غزلوں کو لائقِ مطالعہ ہی نہیں بلکہ عہدِ حاضر کا ایک رزمیہ بنا دیا ہے جس کا پُر شوق مطالعہ ایک نئ جمالیاتی دنیا میں لے جاتا ہے۔ جہاں زمان و مکاں ماضی و حال باہم مدغم ہو کر غزلیہ شاعری کی ایک ایسی لَے اور ایک ایسا آہنگ بن جاتے ہیں جہاں شاعری صرف ادب ہی نہیں بلکہ فکر و فلسفہ، تاریخ و تہذیب کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں جن کی معنویت و مقصدیت کا دائرہ پھیل کر قوسِ قزح کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک آفاقی معنویت کا علمبردار۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی(الٰہ آباد)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی ایک ہمہ جہت فنکار ہیں، وہ غزل گو بھی ہیں اور نظم گو بھی، اس طرح ماہیا بڑی چابکدستی سے کہہ دیتے ہیں۔ حمد یہ ماہیوں میں بھی ان کی فنکاری جھلکتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ آج کے معاشرے پر بھی ان کی نظر ہے۔**ڈاکٹر عبدالرب استاد**(گلبرگہ)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ زیست کے فلسفوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے حیات و ممات کے مباحث میں الجھ کر موت کو سینے سے لگایا ہے انہوں نے زندگی کو عذاب اور موت کو شباب کی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کا ایقان ہے کہ موت کا خلوص زندگی کے فریب پر بھاری پڑ جاتا ہے۔ موت سے قبل زندگی کے قرض کی ادائیگی کا خیال ہمیں چونکاتا ہے اور ہر لمحہ دعوتِ فکر دیتا ہے۔۔۔۔ وہ آلام و مصائب سے گھبراتے نہیں بلکہ ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ غموں سے فرار حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا راستہ نکالتے ہیں۔۔۔۔۔۔ حیدر قریشی جدید لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ وہ جدید خیالات، جدید حسّیات، جدید تشبیہات و استعارات، جدید لفظیات اور جدید تراکیب تراشتے ہیں۔ وہ خیال

اور مضامین دونوں کی جدّتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ان کی شاعری میں مشینوں کی گڑگڑاہٹ کا بیان نہیں ملتا لیکن مشینوں کی حکومت نے انسانی احساسات پر جو قبضہ جمانے کی کوشش کی ہے اس سے بیزاری کے نقوش ضرور مل جاتے ہیں۔ان کے شعروں میں تنہائیوں کا کرب،ہجرت کی تکالیف،سینوں کے داغ،اور دلوں کے زخم کی صدائیں گونجتی ہیں۔وہ گلوبلائزیشن کے حصار میں گھری زندگی اور اس کے مسائل کا عکس پیش کرتے ہیں۔دنیا تیزی سے ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔رشتوں کی جڑیں کھوکھلی ہوتی جارہی ہیں۔پیار،محبت اور ایثار وخلوص کی عمارت ٹوٹتی جارہی ہے۔جدید ترین قمقموں کی فراوانی کے باوجود اندھیروں کی سلطنت بڑھتی جارہی ہے۔دوریاں سمٹتی جارہی ہیں مگر دلوں کے درمیان فاصلے وسیع ہوتے جارہے ہیں۔تنہائیاں ہر طرف اپنا جال بن رہی ہیں۔ایسی حالت میں شاعر کے دل کا اداس ہونا عین فطری ہے۔وہ گہری سوچ میں ہے۔کسی مسئلے کی طرف وہ مسلسل سوچ رہا ہے لیکن خیالات کے نہ ختم ہونے والے سمندر میں اس کی ذات مزید ڈوبتی جارہی ہے اور وہ اپنے وجود سے بے خبر اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ہے۔**معید رشیدی**(دہلی)

....

جرمنی میں مقیم حیدر قریشی ویسے تو اردو کی معروف شخصیت ہیں اور نثر و نظم کے میدان میں اپنی اہمیت وعظمت ثابت کرا چکے ہیں۔انہوں نے مختلف اصنافِ ادب کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔شاعری میں بھی حیدر صاحب کی شخصیت مثلث کی حیثیت رکھتی ہے اور غزل، ماہیا، نظم کے زاویوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔یہ مثلث ایسا ہے کہ جو نہ صرف ان کی شاعرانہ قدرتِ کلام کو ظاہر کرتا ہے بلکہ متنوع شخصیت کے پہلو بھی اُجاگر کرتا ہے۔اُن کی غزلیں پڑھ کر بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے،۔۔ماہیا نگاری میں وہ یدِطولیٰ رکھتے ہیں اور نظم گوئی میں بھی وہ بہر صورت کامیاب ہیں۔کس کو کس پر ترجیح دی جائے؟اگر قاری کے سامنے یہ سوال کھڑا کیا جائے تو وہ پس وپیش میں پڑ جائے گا کیونکہ مثلث کے تینوں زاویے اُسے دلکش دکھائی دیں گے اور ہر زاویہء نظر سے حیدر قریشی کی تصویر عظمت کا پیکر بن کر اُبھرے گی۔**ڈاکٹر جمیلہ عرشی**(جے پور،راجستھان)

....

حیدر قریشی بنیادی طور پر غزل گو شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کی غزلوں میں مشرقیت سانس

لیتی محسوس ہوتی ہے۔حیدر قریشی رموزِ شاعری سے واقف ہیں۔اس لیے انہوں نے جو کچھ کہا وہ ان کے ذوق اور سلیقے کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔حیدر قریشی کی شاعری روایتی اور جدید دونوں موضوعات کا حسین امتزاج ہے۔۔۔۔۔۔۔حیدر قریشی نے اپنی شاعری میں عشق کو محض تذکرے کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ انہوں نے عشق کو اس کی تمام تر حرارتوں اور جذباتی محرکات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کا محبوب روایتی غزل کا خیالی ہیولہ نہیں بلکہ یہ ان کی دنیا کا باسی ہے جو ان کے اردگرد اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔۔حیدر قریشی کی غزل میں علم بیان کے ساتھ ساتھ علم بدیع کی خوبصورتی بھی ہے۔۔۔۔۔حیدر قریشی کی نظموں کے رنگا رنگ موضوعات اپنی مکمل قوت اور توانائی کیساتھ تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ اور کائنات کی تخلیق کے روپ سروپ لیے قاری کے حواس پر اثر انداز ہوتے محسوس ہوتے ہیں۔جو اپنے دور کے لوگوں کو محبت وامن کی نوید اور پرانی رنجشوں کو بھلا دینے کا درس دیتے ہیں۔ان کی نظموں میں لفظوں کی پیچ در پیچ زنجیروں میں زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔**منزہ یاسمین**(بھاول پور)

....

اگر مغربی ممالک میں قیام پذیر اردو کے سارے شاعروں،ادیبوں کا جائزہ لیا جائے تو اپنے اپنے اصنافی دائرے میں سب اچھا کام کر رہے ہیں۔کوئی شاعر ہے،تو کوئی افسانہ نگار۔۔کوئی نقاد اور محقق ہے تو کوئی خاکہ نگار۔۔۔کوئی انشائیہ نگار ہے تو کوئی سفر نامہ نگار۔۔۔کوئی سوانح نگار ہے تو کوئی یاد نگار۔۔۔بعض ادباء نے ایک سے زیادہ اصناف میں بھی کام کیا ہے لیکن حیدر قریشی نے جتنا کثیر الجہت کام کیا ہے اور اس میں جس طرح اپنا عمومی معیار بھی برقرار رکھا ہے اس کے باعث مغربی ممالک کے شاعروں اور ادیبوں میں تو حیدر قریشی کا بالکل الگ ایک مقام بن چکا ہے جس میں وہاں کوئی بھی ان کا مدمقابل دکھائی نہیں دیتا۔**پروفیسر فرحت نواز**(رحیم یار خاں)

....

(حیدر قریشی) کی تحریروں میں کشمکشِ زیست غالب عنصر ہے۔مگر ان کی شاعری میں تہذیبی جلا وطنی اور سیاسی متعلقات بھی ہیں۔ان کے شعری اسلوب میں سرائیکی لسانیات کا اردو میں نفوذ بھی نظر آتا ہے۔شعری صنف ''ماہیا'' پر ان کا کام بڑے معرکے کا ہے۔

وہ خواب گر بھی ہیں اور خواب شکن بھی۔۔۔۔۔**احمد سھیل**(امریکہ)

انٹرنیٹ کے ذریعے مکالمہ

(حیدر قریشی کی تخلیقات اور تحریروں کی روشنی میں)

ڈاکٹر نذر خلیق (خانپور)

ڈاکٹر نذر خلیق کے لیے ہوئے ایک پرانے اور طویل انٹرویو میں سے شاعری سے متعلقہ حصہ یہاں دیا جا رہا ہے۔(ح۔ق)

نذر خلیق: میں کوشش کروں گا کہ انٹرویو کے روایتی سوالوں سے بچ کر ایسے سوال کر سکوں جن سے آپ کے فن کی مختلف جہتوں کو سمجھنے میں آپ کے جوابوں سے کچھ مدد مل سکے۔تو میں آپ کی شاعری سے بات شروع کرتا ہوں۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے شاعری کے حوالے سے تمام

امکانات کو پالیا ہے اور آپ کی شاعری کے بارے میں جو کام ہوا ہے یا جو رائے دی جا رہی ہے مکمل اور جامع ہے؟

حیدر قریشی: ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں کہوں میں اپنی شاعری کے سارے امکانات کو پا چکا ہوں۔ہاں کچھ عرصہ سے شاعری کی روانی قائم نہیں رہی۔لیکن یہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔میرا پہلا شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' شاعری شروع کرنے سے ۲۰ سال کے بعد شائع ہوا۔اور چوتھا شعری مجموعہ ''دعائے دل'' چار سال کے عرصہ میں مکمل ہو گیا، جبکہ اس کی زیادہ تر شاعری ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء کے دو برسوں کی ہے۔اب پانچ مجموعوں کی کلیات مکمل کرنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ شاعری میں کچھ ٹھہراؤ سا آ گیا ہے۔لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ سب عارضی وقفے ہوتے ہیں۔ویسے ممکن ہے میری نثر کی طرف اور انٹرنیٹ کی طرف توجہ زیادہ دینے کی وجہ سے شاعری نظر انداز ہو رہی ہو۔باقی میری شاعری پر جتنا کام ہوا ہے، ہر جائزہ لینے والے کے اپنے مزاج کی بات ہے۔ممکن ہے کچھ اور لکھنے والے کسی اور زاویے سے بھی جائزہ لے سکیں۔

نذر خلیق: آپ غزل، نظم اور ماہیے میں سے کسے ترجیح دیں گے، کسے زیادہ اہم کہیں گے؟

حیدر قریشی: دراصل شاعری ہو یا دوسری نثری اصناف ہوں یہ سب اظہار کے مختلف پیمانے ہیں اور میں جب کوئی تخلیقی اظہار کرتا ہوں تو اس کی نوعیت کے مطابق اس کا پیمانہ از خود اسی فارم کی صورت میں آ جاتا ہے۔اس لئے کسی کو بھی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔البتہ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اب پھر کہہ رہا ہوں کہ شاعری میری پہلی محبت ہے۔اس میں غزل اظہار کا پہلا پیمانہ تھا۔اس کے باوجود کسی صنف کو کسی دوسری پر ترجیح دینا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔

نذر خلیق: میں ابھی صرف شاعری تک محدود رہ کر بات کرنا چاہتا ہوں۔آپ نے شاعری کے لئے صرف ان تین اصناف کو ہی چنا ہے۔متعدد دوسری نئی اور پرانی اصناف میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اس کی کیا وجہ ہے؟

حیدر قریشی: آپ پہلے سوال کو پھر گھما لائے ہیں۔میں نے جن اصناف میں اظہار کیا ہے وہی میرے مزاج سے مطابقت رکھتی تھیں۔باقی اصناف شاید میرے مزاج اور میرے تخلیقی تجربے سے میل نہ کھاتی ہوں گی۔کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے کسی دوست کا خط آیا میں فلاں صنف کا ایک

انتخاب ترتیب دے رہا ہوں۔آپ فوری طور پر اتنی رباعیات، یا اتنی کہہ مکرنیاں، یا کچھ اور بھیج دیں۔ان سارے دوستوں کی پر خلوص پیش کش کے جواب میں ہمیشہ میں نے معذرت کی ہے۔اگر کبھی اندر سے لہر اٹھے تو ہوسکتا ہے میں وہ شاعری بھی کرلوں جس کی مجھ سے فرمائش کی گئی تھی۔لیکن اگر اندر سے لہر نہیں اٹھتی تو محض چھپنے کے لئے یا کسی انتخاب میں شامل ہونے کے لئے ایسی فرمائشی شاعری کرنا میرے لئے مشکل ہے۔

نذر خلیق : اپنی غزلوں کے معیار کے سلسلے میں آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

حیدر قریشی: اگرچہ اپنے اظہار کے لئے میں اس حد تک مطمئن ہوں کہ جو کہنا چاہتا ہوں کسی نہ کسی رنگ میں کہہ لیتا ہوں، تاہم مجھے کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ طبیعت کی موزونیت کے باوجود مجھے کوئی اچھا رہنما مل جاتا تو عروض کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ میرے لئے مفید ثابت ہوتی۔مجھے کبھی کبھی اپنی اس کمی کا احساس ہوتا ہے۔

نذر خلیق: لیکن ماہیے کے اوزان کے سلسلے میں تو آپ نے خاصی عروضی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

حیدر قریشی: نہیں یار۔۔وہ تو ماہیے کی لَے کو برقرار رکھنے کے لئے مجبوراً تھوڑی شد بد حاصل کرنا پڑی۔اس میں بھی میں نے لَے کو بنیاد مان کر اس کی رینج میں آنے والے سارے معین اوزان اور مختلف اوزان کو یکجا کیا ہے۔بلکہ اس عمل کے دوران عروضی میدان میں اپنی کم علمی کا احساس اور بڑھ گیا ہے۔البتہ جب میں کئی اپنے جیسے عروض سے نابلد لوگوں کو بڑے ناز کے ساتھ ماہرِ عروض کے طور پر بولتے اور لکھتے دیکھتا ہوں تو ان کی بہادری پر حیرت بھی ہوتی ہے اور شرمندگی بھی۔

نذر خلیق: آپ کی ذاتی زندگی کا عکس آپ کی شاعری میں بہت دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر شفیق احمد صاحب نے تو اس وجہ سے اپنے مضمون میں اس کا تفصیلی ذکر بھی کیا ہے۔

حیدر قریشی: شاعری کا ایک دور وہ تھا جب میں شعری روایات کے زیرِ اثر بیت برائے بیت کہہ رہا تھا۔لیکن یہ میری شاعری کا عبوری دور تھا جسے میں نے جلد عبور کرلیا۔اس کے بعد میری شاعری میرے گہرے مشاہدے یا ذاتی تجربات کا پرتو ہے۔اسی لئے اس میں میری ذاتی زندگی موجود ہے۔میری زندگی میں موجود لوگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔

نذر خلیق: کیا اس لحاظ سے آپ ترقی پسندوں اور حقیقت پسندوں کے قریب نہیں آجاتے جو شاعری اور ادب کو زندگی کا عکاس قرار دیتے ہیں؟

حیدر قریشی: شعر و ادب محض زندگی کے عکاس نہیں ہیں۔اس سے سوا بھی بہت کچھ ہیں۔تاہم جہاں تک ترقی پسندی کی اس روایت کا تعلق ہے کہ یہ زندگی کی بات کرتی ہے تو یقیناً میری شاعری اس لحاظ سے ترقی پسند روایت سے قریب ہے۔

نذر خلیق: لیکن آپ ڈاکٹر وزیر آغا کے زیرِ اثر ترقی پسندوں سے خاصے دور ہیں؟

حیدر قریشی: مزیدار سوال ہے۔دراصل میری ذاتی زندگی ایک مزدور کی زندگی ہے جس کی ترجمانی ترقی پسند کرتے ہیں۔ظاہر ہے میں ترقی پسندی کے اس سارے عمل سے پوری زندگی گزرا ہوں۔استحصالی قوتوں سے ہر قدم پر لڑائی لڑی ہے۔اگر میں ادبی سطح پر ترقی پسند حلقے میں شامل ہوتا تو اس کے نتیجہ میں میرے ہاں بلند آہنگ نعرہ بازی کی حد تک آجاتا۔اس لحاظ سے وزیر آغا کی فکر میرے لئے بہت بابرکت ثابت ہوئی کہ میں عملی زندگی میں ترقی پسند ہو کر خارجی محاذ پر لڑتا رہا اور ادبی طور پر میں نے خارج کے بجائے اپنے داخل پر توجہ مرکوز کی۔یوں میرے ہاں داخلیت اور خارجیت کا ایک توازن فطری طور پر آگیا۔

نذر خلیق: لیکن داخلیت کی اہمیت کو ماننے والے تو ایک قدم آگے بڑھ کر باہر کو بھی اندر کا ہی ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔

حیدر قریشی: بھائی! یہ تو ادبی مباحث ہیں چلتے رہتے ہیں۔ہر علمی نکتہ میں کوئی نہ کوئی مفید یا مزے کی بات ہوتی ہے۔میں سلطان باہو کو پڑھ رہا تھا۔جب ان کے اس مصرعہ پر پہنچا ظاہر باطن عین ایانی ہُو ہُو پیا سینوے ہُو۔۔۔۔تو مجھے لگا کہ داخل اور خارج کی بحث اپنی علمی اہمیت کے باوجود تخلیق کی اعلیٰ اور صوفیانہ سطح پر جا کر بے معنی ہو جاتی ہے۔لیکن ایسا صرف صوفیانہ تجربے جیسے تخلیقی لمحہ میں ہوتا ہے۔اس کے بعد پھر وہی مباحث ہیں اور ان پر سب کے اپنے اپنے دلائل ہیں۔اور ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

....